

افکار

(۱)

[پچھلے دوراء سے ہم ”فکر و نظر“ کے متعدد قیمتی صفحات ماہنامہ ”بینات“ میں ایک فرضی نام سے شائع شدہ مضمون ”فضل الرحمن کی تحقیق ربوہ کی حقیقت“ کی نذر کر رہے تھے۔ یہیں اتمام حجت منظور تھا۔ ورنہ قارئین کرام نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ اس مضمون کا علمی معیار اور اس کا لب و لہجہ ہرگز اس لائق نہ تھا کہ وہ ان کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ اس مضمون میں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ کتابوں کے بالکل غلط حوالے اور تحریف شدہ ترجمے پیش کئے گئے ہیں اور ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کی طرف واوین میں ایسی عبارتیں منسوب کی گئی ہیں جو سراسر من گھڑت ہیں۔ ہم دل پر جبر کر کے اور قارئین کرام سے معذرت چاہتے ہوئے اس مضمون کی دو قسطیں شائع کر چکے ہیں۔ پہلی ہی قسط پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے ماہنامہ ”بینات“ کے عالم شفیق اور نقاد ارکان ادارہ کی توجہ اس مضمون کی تحریفات کی طرف مبذول کرائی تھی، ہمیں امید تھی کہ یہ محترم حضرات فرضی نام سے لکھنے والے اطفالِ مکتب کی دل آزاں تحریروں کو اولاً اپنے موقر رسالہ میں جگہ نہ دیں گے اور اگر اس پر کسی دینی مصلحت کی وجہ سے انہیں اصرار ہی تھا تو اب اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ تادم تحریر رسالہ ”بینات“ یا مدرسہ عربیہ اسلامیہ (فیوٹاؤن کراچی) جس کا یہ رسالہ ترجمان ہے، ان دونوں موقر اداروں میں سے کسی کا کوئی ذمہ دار رکن فرضی نام سے تین طویل

(۱) اگر صرف اصل زر واپس لیا جائے تو اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوتا۔

(۲) اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائے تو یہ مقروض پر ظلم ہوگا۔

اسی کا نام ربوا ہے۔ یعنی زر اصل سے کچھ بھی زیادہ لینا۔ کہتے کہ اس میں کوئی الجھاؤ کسی قسم کا القباس۔ کوئی شک و شبہ کوئی دشواری یا مشکل ہے ؟

۲۔ ڈاکٹر صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ سود در سود (سود مرکب) تو حرام ہے لیکن سود مفرد حرام نہیں، تو یہ نتیجہ بوجہ غلط ہے۔ یہ نتیجہ انہوں نے حسب ذیل آیت سے نکالا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبُطْءِ ۖ ضِعْفًا
مُضَاعَفَةً (۱۶۴)۔
سہ چند ہونے والا ربوا کھانا چھوڑ دو۔

امام راعب نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضَاعَفَةً در اصل ضِعْفٌ سے ہے جس کے معنی ”کم کرنے کے ہیں۔ ضِعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربوا جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں بلکہ درحقیقت (ضِعْفٌ) کم کرنا ہے۔ ربوا سے معائنہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار کی کمانے کی صلاحیتوں اور قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے قومی معیشت بہت گھٹ جاتی ہے۔ بڑھتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ ربوا سے افراد کی کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور قومی دولت میں کمی آ جاتی ہے۔

لیکن اگر اَضْعَافًا مُضَاعَفَةً کے معنی ”دوچند۔ سہ چند“ بھی لئے جائیں تو بھی اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ قرآن کریم صرف مرکب سود (ربوا) کو حرام قرار دیتا ہے۔ مفرد ربوا کو جائز ٹھہراتا ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ممنوع چیزوں کی شدید ترین شکل کو سامنے لا کر ان سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔

قرآن کا انداز

اس سے اس کا مقصد ان چیزوں کی ہر شکل سے اجتناب ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ حج میں ہے کہ وَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (۲۳)۔ تم بتوں کی گندگی سے بچو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم صرف بتوں کی گندگی سے بچو۔ باقی ہر قسم کی گندگی سے بے شک ملوث ہوتے رہو۔ یا سورہ بقرہ میں ہے۔ فَلَا رِفْثٍ وَلَا فَسُوقٍ وَلَا جِدَالٍ فِي الْخَبْرِ (۵۰)۔ حج میں نخش کلامی۔ گناہ کے کام۔ اور لڑائی جھگڑا مت کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان باتوں سے صرف حج کے آیام میں باز رہو۔ سال کے باقی حصوں میں یا دوسرے مقامات پر یہ سب کچھ کرتے، ہو۔ ظاہر ہے کہ بے حیائی اور گناہ کی باتیں بہر حال ناجائز ہیں۔ ان کی

کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اجازت نہیں۔ قرآن نے حج کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا کہ ایسے اجتماع میں ان امور شنیعہ سے اجتناب اشد ضروری ہے یا اس لئے کہ اس زمانے میں لوگ حج کے اجتماع میں بھی ان باتوں سے باز نہیں آتے ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم یہ ہے کہ یہ باتیں ہر حال میں میعوب اور ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن ان اجتماعات میں ان سے اجتناب اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی صورت اضعاً مضاعفہ کی ہے۔ یعنی ربوہ اور ہر سال میں ناجائز ہے۔ لیکن جب وہ مرکب سود کی شکل اختیار کر جائے تو وہ اور بھی زیادہ شدید طور پر خطرناک ہو جاتا ہے۔ اگر (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا ہے) حاملت صرف سود مرکب کی ہوتی تو سورہ بقرہ کی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم تو یہ کرو تو تمہارے لئے صرف اصل زر واپس لینا جائز ہے۔ وہاں یہ کہنا چاہئے تھا کہ تم اصل زر کے ساتھ اتنا اور لے سکتے ہو۔ جتنا سود مفرد کے حساب سے بنتا ہے۔ اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوگا۔ لیکن قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے صرف اصل زر واپس لینے کی اجازت دی ہے۔ اس پر ایک پانی بھی زیادہ لی جائے گی تو وہ ظلم ہوگا۔ اسی طرح اس سے پہلی آیت میں جو اس نے کہا ہے کہ وَذُرْ ذَا مَآئِقٍ مِّنَ الرَّبِّ (۲۸) ”جو ربوہ تم نے ابھی تک وصول نہیں کیا اسے چھوڑ دو“ تو ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق کہنا یہ چاہئے تھا کہ سود مفرد کے حساب سے جس قدر رقم بنتی ہے اسے مجرا بیکر بقیا چھوڑ دو۔ قرآن نے ایسا نہیں کہا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ اس کے نزدیک مطلق ربوہ احرام ہے۔

قرآن کی رو سے ربوہ کے معنی ہوئے، اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظام معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ محنت (LABOUR) کا ہے یا سرمایہ (CAPITAL) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لیئس معاوضہ کس چیز کا جائز ہے؟ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَّا سَعَىٰ۔ (۵۳)۔ انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہذا لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ وہ ربوہ ہے۔ قرآن کریم کی رو سے حرام ہے۔ اور خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کے مرادف۔ آپ غور کیجئے کہ ایک کاشتکار آپ سے ایک ہزار روپیہ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ

ربو کی مختلف شکلیں | ایک قطعہ اراضی خرید کر اس میں کاشت کرے۔ اور اس کی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی پالے اور آہستہ آہستہ آپ کا قرضہ بھی ادا کر دے۔ آپ اسے ایک ہزار روپیہ قرض نہیں دیتے۔ لیکن اسی روپے سے وہ قطعہ اراضی خرید کر اسے بٹائی یا پیٹ پر دے دیتے ہیں۔ وہ اس میں سال بھر محنت کر کے فصل لاتا ہے اور اس میں سے نصف پیداوار آپ لے جاتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا ہے اور اس کے باوجود آپ کا قرض اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربو انہیں ؟

یا ایک دکان دار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے آپ اسے روپیہ دے دیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار۔ وہ دن رات کی محنت شاقہ سے کاروبار کرتا ہے لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں وہ آپ کو منافع کا حصہ دے چلا جاتا ہے لیکن آپ کا اصل زر اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربو انہیں ؟ یا آپ اس کاروباری آدمی کو براہ راست قرض نہیں دیتے۔ آپ اپنا روپیہ بینک میں جمع کر دیتے ہیں اور بینک کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ کیا یہ ربو انہیں ؟ یہ سب ربو ہے اور قرآن کی رو سے ناجائز خواہ اسے سود مفرد کے حساب سے شمار کیا جائے۔ یا سود مرکب کے حساب سے۔

جو کچھ ہم لیتے ہیں | آپ غور کیجئے تو باذاتی اتقن یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) عطیہ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفہ دیتا ہے۔ لہذا اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی صورت اس صدقہ کی ہے جسے کسی ضرورت مند کی مدد کے لئے حبثہ اللہ دیا جاتا ہے۔ قرآن کی رو سے وہ ضرورت مند اس امداد کو معاشرہ سے بطور اپنے حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) اجرت۔ یہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اس میں سرمایہ کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) ربو۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زائد وصول کیا جاتا ہے سرمایہ دینے والا محنت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کر لیتا ہے۔

(۴) منافع (تجارت میں)۔ اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے۔ اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) قمار (جوا) اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔

(دشمنِ اول کو چھوڑ کر) آپ باقی شکلوں کو دیکھئے۔ جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، اسے قرآن جائز

معاوضہ محنت کا ہے | اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ

بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربوہ میں فرق کیا ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے اسے دس روپے اصل زر سے زائد وصول ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپے قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے اس سے اُسے بھی دس روپے

اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے؟

خَالِكٌ بَأْتَهُمْ قَالُوا إِنَّهُمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الْرَبْوَةِ (۲۵/۲۶)۔ وہ بیع اور ربوہ کو ایک جیسا سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ ان کی بھول ہے۔ یہ دونوں ایک نوعیت کا معاملہ نہیں بیع میں سرمایہ اور محنت

دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آ جاتا ہے۔ اور دکان دار کو اس کی محنت کا معاوضہ، سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ لیکن ربوہ میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف

بیع اور ربوہ میں فرق | نہیں ہوتی۔ لہذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے۔ جو حرام ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ہے کہ

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ ربوہ ہے کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا۔ محنت کا نہیں۔ اس بات کا یقین معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا جونا چاہئے۔

وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (RISK) لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربوہ میں (RISK) نہیں ہوتا۔ لیکن حلت

اور حرمت کے لئے یہ معیار تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (RISK) ہی ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں (RISK) ہوتا ہے۔ بیع اور ربوہ میں فرق وہی ہے جسے

اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بیع میں اس المال محنت کا معاوضہ واپس ملتا ہے اور ربوہ میں اس المال +

را اس المال کا معاوضہ ملتا ہے۔ محنت کا معاوضہ حلال ہے۔ اس المال کا معاوضہ حرام۔
دشواہریاں کیوں پیش آتی ہیں | آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رو سے ربوہا کا مسئلہ
 کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس میں جو دشواہریاں

آج کل پیش آرہی ہیں، ان کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) ربوہ کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنہیں قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے لیکن (بدقسمتی سے)
 ہماری مروجہ شریعت اسے حلال قرار دیتی ہے۔ (مثلاً زمین کی بٹائی یا مضاربیت یعنی کاروبار میں
 ایسی شراکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع و وصول کرتی ہے۔ یا تجارت میں جس قدر بھی منافع
 لیا جاسکے وغیرہ) ہمارے ارباب شریعت اسے برواشت ہی نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم
 کر لیں۔ اس لئے وہ ربوہ کی تعریف ایسی کریں گے جس کی رو سے یہ شکلیں ربوہ کی شق میں نہ آسکیں۔
 (۲) سرمایہ دار طبقہ بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ محنت کے تصور سے
 انہیں پسینہ آجاتا ہے۔ اس لئے وہ ربوہ کے قرآنی تصور کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواہری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے۔ بجائے اس کے کہ
 ہم اس نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے ہیں کہ اس
پیوند سازی سے کام نہیں چلے گا | میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی

ہو گیا ہے۔ لیکن وہ پیوند اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں
 کچھ ترمیم کر کے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے۔ لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب
 نہیں ہو سکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔
 قرآن کے معاشی نظام کی رو سے :-

۱۔ زمین ذریعہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا۔ پانی۔ روشنی کی طرح) نوع انسان کی پرورش
 کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اُمت کی تحویل
 میں رہے گی تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے۔ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو
 زمین سے برآمد ہو۔ اس میں اناج اور مصنوعات کے لئے خام مسالہ سب آجاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ
 نہیں سکتی۔ اس لئے افراد کے لئے جائدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ (INVEST) کرنے کا سوال

پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عالم ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی کا دست نگر نہیں ہونا پڑتا۔ لہذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(د) حتیٰ کہ اس میں انفرادی تجارت کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں دکاندار اشیائے ضروریات تقسیم کرنے کی ایجنسی ہوگا۔ اس سے نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بتایا جائے گا۔ اس کی محنت کا معاوضہ نظام کی طرف ملے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں ربلو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت **دو متضاد نظام** یہ ہے کہ ربلو اسود کا نام نہیں۔ یہ ترجمان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی

نظام کی یکسر ضد ہے۔ قرآنی نظام میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے۔ غیر قرآنی نظام میں، ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس قدر ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ قرآن نے اس نظام کو ”خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ“ قرار دیا ہے۔ یہ نظام فی الواقعہ قرآنی نظام سے بغاوت ہے۔ اب اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے ربلو کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کر لیں۔ اس قسم کی کوشش ہم نے اس سے پہلے اپنے جاگیر داری اور زمین داری دور (عہد عباسیہ) میں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے زمین کی بٹائی۔ مضاربت۔ تجارت میں غیر محدود منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ جو کوشش اب ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم بینکوں کے سود یا صنعتی اداروں کے سود یا صنعتی اداروں کے حصوں پر منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب در فریب میں مبتلا کر لیں گے۔ **بینکوں کے سود کی مخالفت**

طبقہ کی طرف سے ہو رہی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات اسے اسلامی نظام معیشت کے خلاف پالتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کے سود کا مسئلہ اس وقت موجود نہیں تھا جب ہماری فقہ مرتب ہوئی ہے اسے اب ”جائز“ کی فہرست میں داخل کرنا ان کے نزدیک ”بدعت“ ہے۔ اگر یہ شکل اس وقت موجود ہوتی تو جس طرح زمین کی بٹائی اور مضاربت وغیرہ جائز قرار دے دی گئی تھیں، ممکن ہے یہ بھی اسی فہرست میں شامل ہو جاتا۔ بینک کا سود تو بٹائی وغیرہ کے مقابلے میں استحصال (EXPLOITATION) کی بہت

نرم شکل ہے۔

اشتراکیت کی آڑ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری ایک اور ہے اور وہ یہ کہ ہمارے زمانے میں اشتراکیت (کیونرم) نے ایک ایسے نظام کی طرح ڈالی ہے جو نظام سرمایہ داری کی ضد ہے۔ اور چونکہ قرآنی نظام بھی سرمایہ داری کی ضد ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اشتراکیت نظام اور اسلامی نظام کی بعض جزئیات کی باہمی مماثلت (یعنی ایک دوسرے سے ملنے جلتے ہونا) فطری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اشتراکیت فلسفہ زندگی اسلامی فلسفہ حیات کی ضد ہے۔ اس چیز کو ہمارا اقدامت پرست مذہبی طبقہ ایک موثر حربہ کے طور پر استعمال کرتا ہے تفصیل اس جمال کی یوں ہے کہ :-

(۱) مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آ رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت بجائے خویش نظام سرمایہ داری ہی کی ایک شاخ ہے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ محنت کے بغیر دولت حاصل ہو جائے۔ محنت نہ مذہبی پیشوا کرتے ہیں نہ سرمایہ دار سرمایہ دار تو پھر بھی روپیہ لگا کر روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ مذہبی پیشوا بغیر روپیہ لگائے دوسروں کی کمائی بٹو لیتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی شدید ترین شکل ہے۔ لہذا مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قرآنی نظام معاشی کی مخالفت فطری امر ہے۔ (۲) لیکن ان میں اتنی جرات ہے نہیں کہ یہ کھلے بنوں قرآنی نظام کی مخالفت کریں۔ نہ ہی ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جن کی رو سے یہ اس نظام کو خلاف اسلام قرار دے سکیں۔ لہذا یہ کرتے یہ ہیں کہ

(۳) جوں ہی کسی نے قرآن کے معاشی نظام کا ذکر کیا انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ اور چونکہ (جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے) قرآنی نظام اور اشتراکیت نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے اس لئے عوام اور سطح بن پڑھے لکھے لوگ فوراً ان کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ اور ایسا کہتے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اس پراپیگنڈے کا اثر یہاں تک پہنچ گیا

سے اس نکتہ کی وضاحت طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت باب المراسلات میں ایک خط کے جواب میں کی گئی ہے۔ اسے دوبارہ دیکھ لیا جائے۔

ہے کہ سینے میں درد مند دل رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ملک میں بھوک اور افلاس کا علاج ہونا چاہئے کہ مبادا وہ کمیونسٹ نہ ٹھہرا دئے جائیں۔ قرآنی نظام کی مخالفت کے لئے، مذہبی پیشوائیت کا یہ حربہ بڑا کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ عوام کی نگاہیں ظاہر ہیں ہوتی ہیں۔ انہیں یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے ان جزئیات کو پیش کرنے والا ضروری نہیں کہ اشتراکی ہو۔ وہ سچا مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔ بنیادی فرق، اسلام کے فلسفہ زندگی اور اشتراکی فلسفہ حیات میں ہے۔ اشتراکی فلسفہ حیات کا ماننے والا بیشک مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کے کسی جز کا یا ہمدگر مماثل ہونا، اسلامی نظام کے پیش کرنے والے کو کمیونسٹ بنا دیتا ہے تو اس اعتبار سے ہمارے تمام علمائے کرام کمیونسٹ ہیں۔ اس لئے کہ کمیونزم میں بھی سود ناجائز ہے اور یہ حضرات بھی سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ حضرات تو کمیونسٹ قرار نہیں پاتے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو وہ ان حضرات کے نزدیک فوراً کمیونسٹ قرار پا جائے گا۔ اس لئے نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت کی نفی اسلام کے خلاف ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ حضرات اس پر ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتے ہیں۔

یہ ہے وہ سب سے بڑی دشواری جو اس وقت ان مسائل کے صحیح حل کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔

اسلام اور اشتراکیت | اگر اسلام اور اشتراکیت کے نظریہ ہائے حیات کے فرق کو پیش نظر رکھ کر ان کے معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے علامہ اقبالؒ نے جب سمرقانس یٹنگ ہسپتال کو لکھا تھا کہ

اشتراکیت کا معاشی نظام = خدا = اسلام

تو اس سے ان کی سہی مراد تھی اور جب انہوں نے قائد اعظم سے کہا تھا کہ ہندو اگر اشتراکی نظام معیشت کو اپناتا ہے تو اسے ہندومت سے ہاتھ دھوئے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان اسے اپناتا ہے تو اس کا یہ اقدام اس خالص اسلام کی طرٹ جانے کے مراد ہو گا جو چودہ سو سال پہلے ظہور میں آیا تھا۔ تو اس سے بھی ان کا یہی مطلب تھا۔

معاشی نظام اور فلسفہ زندگی کے فرق کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ

اگر ہم نے اشتراکی نظام معیشت اختیار کیا تو اس کی پابندیاں اور اس کا جبر بھی قبول کرنا ہو گا جس کے لئے شاید ہم میں سے اکثر تیار نہ ہوں۔

یہ ”جبر“ اشتراکی فلسفہ زندگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر اس نظام کو اسلامی فلسفہ زندگی کے تابع اختیار کیا جائے تو اس میں جبر و استبداد کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کی عمارت انسانی ذات، اسے نشوونما دینے والی مستقل اقدار، قانونِ مہکافاتِ عمل اور اخروی حیات پر ایمان کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور ایمان میں جبر و اکراہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اسلام میں جبر نہیں

اُبھرتا ہے۔ اسی ایمان کے تصور کا فقدان ہے، جس سے اشتراکیت اور جبر و تشدد لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔ اشتراکیت خدا کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشی نظام کو وحی خداوندی کی بنیادوں پر استوار اور ایمان کے ذریعہ قبول اور اختیار کیا جائے۔ اس سے وہ ”جذبہ صدقہ“ اور جذبہ معاونت پیدا ہوتا ہے جسے ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے نظام سرمایہ داری کو کالعدم کرنے کے لئے بنیادی شرط قرار دیا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ہمارے نزدیک ”ہمارے معاشی مسائل کے حل کا طریقہ یہ نہیں کہ کبھی ملکیت زمین کے سوال کو زیر بحث لے آئے اور کبھی بینک کاری پر گفتگو کرنے لگ گئے اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ متعین کیا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا۔

یہ کام ہمارے قدامت پرست طبقہ کے بس کا نہیں۔ اس لئے کہ (۱) ان کے نزدیک وہ معاشی نظام جو عباسی ملکیت کے زمانے میں مرتب ہوا تھا عین اسلامی نظام ہے۔

(۲) ان کی ذہنیت یہ قرار پا چکی ہے کہ جو بات اسلام کے نام سے متعارف ہو کر چلی آ رہی ہے اس پر نظر ثانی نہیں کی جاسکتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ

(۳) ان کے نزدیک قرآن کریم، دین میں واحد اور آخری سند نہیں۔

یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو قرآن کریم کو آخری سند اور حجت تسلیم کریں اور عصرِ حاضر کے اقتصادی تقاضوں پر ان کی نگاہ ہو۔

جب اس طرح، پہلے یہ متعین ہو جائے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے تو اس کے بعد دیکھا جائے کہ ہم اپنے موجودہ نظام سے، اسلامی نظام تک کس طرح تدریجاً پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی پہلے منزل کا تعین کر لیا جائے اور اس کے بعد اس تک تدریجاً پہنچنے کے طرق و وسائل پر غور کر کے چلنا شروع کر دیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہو گا کہ اسلامی نظام، اس کی حکمتِ بالغہ۔ اس کی انفرادیت اور اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کے دعوے کی صداقت کو تعلیم کے ذریعہ آنے والی نسلیں کے دل و دماغ میں اس طرح جاگزیں کیا جائے کہ اس کا مطالبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے اور وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس طرح مضطرب و بیتاب ہوں جس طرح مچھلی پانی میں جانے کے لئے بیقرار ہوتی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا اور ہم ان مسائل کو فرداً فرداً لے کر انہیں اسی طرح بحث و نظر کا موضوع بناتے رہے جس طرح اب تک بناتے چلے آ رہے ہیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ ہم اپنے وقت اور توانائیوں کو ضائع کرتے رہیں۔ ان لوگوں کی طرح جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ غیبت اعمالہم فلا نقیم لہم یوم القیمۃ وزنا..... دحسبون انہم یحسنون صنعا۔ (۱۸۰-۱۸۱) اور اصل مسئلہ جن کا توں رہے۔ بینک کے سود کے مسئلہ ہی کو لیجئے۔ اگر آپ اس سود کو جائز قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

آپ بے محنت کی کمائی کی اس فہرست میں ایک اور شق کا اضافہ کر دیتے ہیں جو قرآنی اصلِ معیشت کے علی الرغم ہمارے ہاں پہلے سے رائج چلی آ رہی ہے۔ مثلاً زمین کی پیداوار کی بٹائی، مضاربت وغیرہ۔ اور اگر آپ بٹائی، مضاربت وغیرہ کو جائز رکھ کر بینک کے سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو آپ کا بینکنگ سسٹم ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار طبقہ اپنا روپیہ بینک کے کاروبار میں لگائے گا ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ قرآن کا معاشی نظام اختیار کر لیتے ہیں تو اس میں اس قسم کی کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئے گی۔ اس وقت افراد کے پاس فالٹو دولت (SURPLUS MONEY) رہے گی

۱۔ اپنے دیکھا ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کے حاصل میں جو کچھ کہا ہے وہ اصولی طور پر وہی ہے جسے ہم نے اپنے اس تبصرے میں پیش کیا ہے۔ یعنی صدقہ اور معاونت کے اسلامی جذبات کو ابھار کر نظام سرمایہ داری کو تدریجاً کا لندم کر دینا۔

نہیں جو اس پر نفع کمانے کا سوال پیدا ہو۔ دولت، ملت کی تحلیل میں لپے گی اور وہیں سے تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ ان ضرورت مندوں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر نفع کمانے کا تصور تک بھی باقی نہیں رہے گا۔
یہ ہے اس مسئلہ کا اصلی حل۔

حدیث کی صحیح پوزیشن

ربوہ کے متعلق بحث تو ختم ہو گئی، لیکن ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کے مضمون میں حدیث کے متعلق ایسی تصریحات آگئی ہیں جن کے متعلق مختصر سی گفتگو ضروری ہے، حدیث کے متعلق بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں جو باتیں (ان حضرات کے خیال کے مطابق) جملگیا بیان ہوئی ہیں، حدیث سے ان کی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے۔ ربوہ کے متعلق ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی تفصیل تو ایک طرف، کوئی جامع اور مانع تعریف بھی قرآن کریم میں نہیں ملتی۔ اور اس کے لئے حدیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کے بعد ڈاکٹر صاحب جس نتیجہ تک پہنچے ہیں وہ حسب ذیل ہے:-

صحیح احادیث کے ذخیرے میں ربوہ کے بارے میں جو شدید معارضے کی صورتیں اور ناقابل حل الجھنیں پائی جاتی ہیں ان کے پیش نظر ربوہ کی کوئی جامع اور مانع تعریف کی کوشش کرنا یقیناً ایک بڑا حوصلہ مندانہ اقدام ہے۔

آپ خود کیجئے کہ ربوہ کو ”خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ“ کہا گیا ہے۔ لیکن ربوہ ہے کیا، اس کی تعریف تک (بقول ان حضرات کے) نہ قرآن سے ملتی ہے نہ احادیث سے۔ فرمایئے کہ ان خیالات کے مطابق دین پر عمل کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہے۔

۲۔ احادیث خود ایک دوسرے سے کس قدر متعارض ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر صاحب بار بار شکایت کرتے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

روایات کے اس شدید معارضے کے علاوہ اور بھی کئی وجہیں ایسی ہیں جن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کردہ اثر کو رد کرنا ضروری ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ کسی ابتدائی مرحلہ پر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ربوہ کے بارے میں قرآن کی تصریحات نامکمل ہیں جن کی تکمیل احادیث کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ مندرجہ بالا آثار شاید اس جذبہ کے ابتدائی مظاہر ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان آثار کی طرح ربوہ کے سلسلہ کی فقہی حدیثوں میں بھی شدید معارضہ ہے۔

حدیثوں کے اس باہمی معارضہ کی علت کے متعلق ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ

اگر اس طریق پر ان احادیث کا جائزہ لیا جائے تو ان میں ایک واضح ارتقائی عمل نظر آنے لگتا ہے ”ارتقائی عمل“ سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا خود نبی اکرم ﷺ اپنے سابقہ ارشادات میں تبدیلیاں فرماتے گئے۔ لیکن ایسا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس سلسلے میں کچھ اور لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضمون میں اس عمل ارتقاء کی ایک مثال پیش کی ہے۔ اور وہ یہ کہ (۱) تیسری صدی ہجری کے ایک لعوی اور بخوی (ذہاج) نے ربوہ کی ایک تعریف پیش کی۔ ازاں بعد اس تعریف نے خود حدیث کی شکل اختیار کر لی۔ (۲) چوتھی صدی ہجری تک اس حدیث کا نام و نشان نہیں ملتا۔ یکا یک پانچویں صدی ہجری میں یہی سنی کی سن میں یہ حدیث نظر آجاتی ہے لیکن اس کی شکل غیر واضح سی تھی۔ اور روایت کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ نہیں پہنچتا تھا (۳) دسویں صدی میں سیوطی رحمہ اللہ کی جامع الضعیف میں یہ حدیث متعین شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ اور اس کا سلسلہ روایت بھی رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے۔ لیکن امام سیوطی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف لکھا ہے۔ دسویں صدی کے اواخر میں یہ حدیث کنز العمال میں ضعیف بھی نہیں رہتی۔ گیارہویں صدی میں مصری عالم العزیزی نے اسے ”حسن لغیرہ“ قرار دے دیا۔ اور (۴) اب چودھویں صدی میں مفتی محمد شفیع صاحب نے فتویٰ صادر فرما دیا ہے کہ ”یہ روایت محدثین کے نزدیک صالح للعمل ہے“

یہ ہے حدیث میں ”عمل ارتقاء“

احادیث کے متعلق اس تحقیق کے بعد آپ سمجھتے ہوں گے کہ ڈاکٹر صاحب کا مسلک | صاحب یہ کہیں گے کہ اس قسم کی چیزیں کبھی قابل اعتماد نہیں ہو سکتیں انہیں مسترد کر دینا چاہئے۔ لیکن آپ غلط سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یہ نہیں کہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ الغرض احادیث کی روشنی میں ربوہ کی تعریف کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تو

کیا اس باب میں تمام احادیث کو یکسر رد کر دیا جائے؟ کیا ان سے انکار کر دیا جائے؟ ہمارا جواب قطعاً نفی میں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان فقہی احادیث میں ارتقائی عمل جس کے کرشمے ہم نے صفحات مابین پر دیکھے ہیں۔ ان کے استناد کو مشکوک اور مشتبہ بنا دیتا ہے لیکن ان کے راویوں اور جامعوں کے ساتھ سو دظن رکھنا اور ان کی کوششوں کو رد کر دینا سخت نادانی ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کی احادیث کو رد نہ کیا جائے تو ان کے متعلق کیا سمجھا جائے؟ کیا یہ سمجھا جائے کہ یہ واقعی رسول اللہ کے ارشادات ہیں اور دین میں سند اور حجّت؟ یا اللعجب!

تبصوۃ بر تبصوۃ

حضرت آدم کو کوفرتوں پر فضیلت حاصل ہونے اور ان کے مسجود ملائک بننے کی وجہ قرآن حکیم کے نزدیک یہ ہے کہ انہیں علم الاسماء حاصل تھا جب کہ فرشتے اس سے محروم تھے۔ افسوس یہ کہ اولاد آدم اس میراث پر ہی کو بھلا کر "فرشتہ" بننے پر مصر رہی ہے۔ دنیا کے فتنہ و فساد کی جزا کثرت یہ موقی ہے کہ متکلم، سامع، اسمائے ملفوظہ اور ان کے بدلولات میں صحیح رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ SEMANTICS کے اس خلفشار کی تازہ ترین مثال ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کے مقالہ "تحقیق ربوا" پر بحث کی شکل میں نمایاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خطہ کے پیش نظر بہت واضح لفظوں میں مقالے کے شروع ہی میں یہ نوٹ درج کر دیا تھا کہ

"فارسی زبان کا لفظ 'سود' قرآنی اصطلاح ربوا کا مترادف نہیں ہے۔ اس فارسی لفظ کے لغوی معنی

'نفع' ہیں، جس کا ضد 'زیان' ہے اور جس کا عربی مترادف 'رجح' ہے۔ اس مقالے میں ربوا کی حقیقت

معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن قرآن کے اصطلاحی ربوا کا اردو، فارسی یا کسی اور عجمی زبان میں ترجمہ

کرنا قائم الحروف کے نزدیک نہ صرف سہمی لا حاصل ہے بلکہ بنائے باطل بھی۔"

اس واضح نوٹ کے بعد سود، سود در سود، سود مرکب اور سود مفرد کی بحث کی ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب کے مقالے کے سلسلے میں ہرگز کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ لیکن خدا بھلا کرے فرشتوں کا، ان کی پیشین گوئی کے برے اثرات سے بچنا آسان تو نہیں۔ بچپن سے سود مرکب اور سود مفرد کے سوالات ایسے سر پر سوار

ہوتے ہیں کہ ربوہ کی بحث میں ان سے خلط بحث کرنے میں مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی ہوں یا جو دہری غلام احمد صاحب پرویز برابر کے ترکیب نظر آتے لگتے ہیں۔ چنانچہ محرم پر دین صاحب نے اپنے تبصرہ کی بنیاد ہی اس خیال پر رکھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب

”اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ قرآن نے صرف (مروجہ الفاظ میں) سود در سود (یا سود مرکب) کو حرام قرار دیا ہے۔ سادہ سود کو نہیں۔“

اس مروجہ غلط فہمی پر بنیاد رکھنے کا جو نتیجہ ہوتا تھا وہ صفحات بالا میں قارئین کرام کے سامنے ہے۔

آگے چل کر محترم پرویز صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ

”قرآن کی رو سے ربوہ کی جامع اور مانع تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے جو سورہ بقرہ کی

آیت ۲۷۹ میں آئے ہیں اور جنہیں ڈاکٹر صاحب نے بھی درج کیا ہے یعنی

دان تبتم فلکم من دس اموالکم اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا اس المال ہے“

آیت محمولہ بالائے چار (۹) الفاظ کو ربوہ کی جامع و مانع تعریف قرار دینا ہمیں حیرت انگیز امر نظر آتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ اس ”جامع و مانع تعریف“ کو بنیاد قرار دیکر پرویز صاحب یہ اصول متعین کرتے ہیں کہ

”قرآن کی رو سے ربوہ کے معنی ہوئے اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا

ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی

نظام معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔“

ربوہ کے قرآنی مفہوم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقالہ میں طویل بحث کی ہے اور قرآن حکیم کے اپنے واضح الفاظ، تحریم ربوہ کی آیتوں کی تفسیر کی تاریخی ترتیب اور جہاں ربوہ کی حقیقت کے بارے میں تاریخی شہادتوں کے پیش نظر انہوں نے اس کی تعریف پیش کی ہے۔ پرویز صاحب نے ان سب سے قطع نظر کر کے قرآنی الفاظ لاتا کلاوا الربا اضعا فافہ کے معنی میں شک ڈالنے کے لئے امام راغب اصفہانی کا ایک قول نقل کر دیا ہے جسے آگے چل کر انہوں نے خود ہی ترک بھی کر دیا ہے۔

یہاں گنجائش نہیں ہے کہ ہم ڈاکٹر صاحب کی اس بحث کو دہرائیں۔ علاوہ ازیں محترم پرویز صاحب سے ان خطوط پر گفتگو کرنا امر غیر مفید بھی ہے اس لئے کہ وہ تاریخی شہادتوں اور روایات کے سہ سے قائل ہی نہیں لیکن محض قرآن حکیم کے اپنے سیاق و سباق ہی کو مد نظر رکھا جائے تب بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ

پرویز صاحب کے یہ دونوں دعوے کہ (۱) آیت وان تبتم فلکم من وُس اموالکم ربوا کی جامع و مانع تعریف ہے اور (۲) ربوا کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے نہیں ہے، باطل ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں ربوا کا ایک خاص نظام تھا جس کی خصوصیت کو واضح کرتے ہوئے قرآن نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ اذا تکلموا الربوا فعنا فامنعنا فحق۔ جب جاہلیت کے ربوا کو قرآن نے حرام قرار دیا تو اسے ترک کرنے کے بعد تو سراسر صرف یہ رہتا تھا کہ قرض خواہ مقروض سے اپنا اصل زر بھی واپس لے یا نہ لے۔ قرآن نے اصل زر واپس لینے کی اجازت یہ کہہ کر دی کہ وان تبتم فلکم من وُس اموالکم (اگر تم قہر کر لو تو اس المال تمہارا ہے) لیکن قرآن کی نگاہ میں یہ بھی ایک رعایت تھی کیونکہ وہ تو دراصل نظام صدقہ کا داعی ہے۔ اسی لئے اس نے اسی سلسلہ آیات میں آگے چل کر کہا ہے کہ وان تصدقوا خیرکم (اور اگر تم اس المال بھی صدقہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے)۔

بات اتنی سیدھی سی ہے لیکن پرویز صاحب وان تبتم فلکم من وُس اموالکم کو ربوا کی جامع و مانع تعریف قرار دیکر اسے الجھا رہے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ آیت ربوا کی تعریف ہو سکتی ہے تو اس سے انکی آیت وان تصدقوا خیرکم اس شرف سے کیوں محروم رہے؟

پرویز صاحب نے زیادہ تر بھاشن کی نظام معیشت کی حمایت پر صرف کی ہے۔ حالانکہ اس کا یہاں کوئی موقع نہ تھا۔ یہ ساری بحث غیر متعلق ہے بالخصوص اس لئے کہ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مقالے میں واضح کر چکے ہیں، اشتراکی مالک بھی بینک اور ان کے سودی کاروبار کو رد رکھتے ہیں۔

حدیث کی "پوزیشن" کے بارے میں پرویز صاحب کے ارشادات لے لئے ڈاکٹر صاحب کا وہ مضمون ملاحظہ کیجئے جو پرویز صاحب کی خدمت میں ایک گزارش کے عنوان سے شامل اشاعت ہے۔